

ادبیات

پروفیسر میاں انعام الرحمن *

خواجہ حسن نظامی کی خاکہ نگاری

اردو ادب میں شاید ہی کوئی دوسرا انشا پرداز ہو جو خواجہ حسن نظامی مرحوم (۱۸۷۸-۱۹۵۵) سے بہتر طور پر آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کا مصداق ہو، حال آں کہ خواجہ صاحب کا شمار اردو ادب کے ان خاکہ نگاروں میں کیا جاسکتا ہے جنہوں نے اس ادبی صنف کو بال و پر عطا کیے اور یہ صنف ’فن‘ سمجھی جانے لگی۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے ’’خواجہ حسن نظامی: خاکہ اور خاکہ نگاری‘‘ کے عنوان سے تالیف پیش کر کے اس اوجھل پہاڑ کو منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مدون تالیف میں ڈاکٹر معین الدین عقیل کے حوصلہ افزا و قیام پیش لفظ کے بعد ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری ’’شذراتِ تقدیم‘‘ کے زیر عنوان خواجہ حسن نظامی کی شخصیت و فن کے مختلف پہلو زیر بحث لائے ہیں جس کے مطالعہ سے قارئین، خواجہ صاحب کی شخصیت کے تقریباً تمام ادبی و شخصی پہلوؤں سے متعارف ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے خواجہ حسن نظامی کی خود غرضانہ تلون مزاجی کا جو نقشہ ’’شذراتِ تقدیم‘‘ میں کھینچا ہے، ہم بوجہ اس کا مطالعہ اور فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ یہاں یہ بیان کرنا بھی مناسب ہوگا کہ طوالت سے بچنے کی خاطر، ہم آئندہ آنے والی سطور میں صرف اور صرف خواجہ حسن نظامی کے رشحاتِ قلم، موضوع سخن بنائیں گے۔

اس تالیف میں مذکور خاکوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصہ اول میں مذہبی علمی فنی ادبی شخصیات کے خاکے اور حصہ دوم میں تاریخی و سیاسی شخصیات کے خاکے ہیں۔ حصہ سوم میں ’’تصویر خصال: ایک نفسیاتی مطالعہ‘‘ کے عنوان سے، قومی، وطنی، طبقاتی، پیشہ وارانہ، کاروبار شیطنت اور فن کار کے دلچسپ خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں ۲۳ صفحات پر مشتمل ایک ضمیمہ ہے جس میں خود ڈاکٹر صاحب نے ’’بہارستان ناز‘‘ اور ’’آب حیات‘‘ کو ایک نئے رخ سے دیکھتے ہوئے مختلف عنوانات کے تحت خاکہ نگاری کی تاریخ اور اقسام بیان کی ہیں۔

اس مدون تالیف کا پہلا خاکہ ہی چونکا دینے والا ہے، اسلوب نگارش یا مواد وغیرہ کی ایک تائی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس ہستی کی وجہ سے جس کا خاکہ پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ یہ کوئی بڑی ادبی شخصیت نہیں، نہ ہی کوئی قداور سیاسی مدبر ہے اور نہ ہی تاریخ کا دھارا بدل دینے والا کوئی نابغہ روزگار۔ یہ ہستی ہے اللہ میاں کی۔ جی ہاں! اللہ میاں۔ خاکے کے لیے اللہ میاں کے چناؤ جیسی خیال کی ندرت اور اسے پیش کرنے کے نرالے ڈھنگ جیسے اسالیب کی بدولت ہی خواجہ صاحب اردو

* شعبہ سیاسیات، گورنمنٹ اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ۔ inaam1970@yahoo.com

_____ ماہنامہ الشریعہ (۱۲) فروری ۲۰۱۰ _____

ادب کے غیر روایتی اور عام فہم انشا پرداز ہیں۔ عام فہم، زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اور اس پہلو سے بھی کہ اللہ میاں سے سارا جہان واقف ہے، اس لیے عام سطح کا قاری بھی خاکے میں مذکور ہستی کو مستور خیال نہیں کرتا اور پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس اولین خاکے کا عنوان، ایک لحاظ سے خواجہ صاحب کی ان جساتوں اور بے باکیوں کا نقیب بھی ہے جن سے قارئین کو دیگر خاکوں میں واسطہ پڑتا ہے۔ اگر بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھی لیکن خواجہ صاحب کی خوبات بڑھانے والی ہے۔ وہ اپنے خاکوں کو صوفیانہ مشرب میں رنگنے کی کوشش کرتے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

”آگے جا کر جس موجودات اور مخلوقات کے حلیے ایک خاک کی بشر کے قلم سے نکل نکل کر کاغذی مجلس میں آراستہ ہوئے ہیں، بس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان سب کے اندر اللہ میاں کا حلیہ موجود ہے، کیوں کہ اس نے خود اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے فرمایا ہے:

ان اللہ خلق ادم علیٰ صورۃ

اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ جو اس کو مانے وہ بھی ان جان اور جو نہ مانے وہ بھی نادان! لہذا یہ کہہ کر ختم کر دینا چاہیے کہ وہ سبحان، واہ سبحان! تو بس بے صورت کی ایک صورت ہے۔“ (غیر مرئی وجود: اللہ میاں، ص ۱۰۲)

لاادری اور ہمہ اوست کے اس آمیزے کو خاکہ نگاری کی بنیاد کے طور پر، ادبی اعتبار سے کہاں تک قابل قبول قرار دیا جا سکتا ہے، اس سے قطع نظر کہ اس کا فیصلہ طویل بحث کا متقاضی ہے، یہاں ایک احساس بہر حال کسی بھی مسلم قاری کو رکنے اور یہ تاثر لینے پر مجبور کر دیتا ہے کہ خاکہ نگار کسی نہ کسی درجے میں ”صلح کل“ کا پرچار کر رہا ہے اور شاید اس کا قلم مذہبی حدود کو پامال کرنے سے رک نہ پائے گا۔ یہ تاثر صفحہ نمبر ۱۶۱ پر قاری کی مذہبی حساسیت کو بیدار کرتا ہے جہاں آنجہانی چوہدری سر ظفر اللہ خاں کے خاکے میں لکھا گیا ہے ”قوم مسلمان، عقیدہ قادیانی“۔ پھر صفحہ نمبر ۱۸ پر مولانا محمد علی جوہر کے خاکے میں قادیانیوں کی اسلامیت پر گواہی اس طرح دی گئی ہے:

”تین بھائی ہیں۔ بڑے بھائی شوکت علی ہیں، ایک بھائی کا نام ذوالفقار علی ہے، وہ قادیانی ہو گئے ہیں۔ گویا ماں باپ کی تین یادگاریں ہیں اور تینوں دین و قوم و ملک پر قربان ہیں۔“

اس کے بعد راہ ہم وار ہونے پر ”ضمیمہ“ کے عنوان سے صفحہ نمبر ۱۹۱، ۱۹۲ پر تین قادیانیوں کے خاکے، ان کی مذہبی عقول کے اعتراف کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ کوئی بھی مسلم قاری اس مطالعہ سے دو قسم کے تاثرات لیتا ہے: ایک، فوری، دوسرا تاخیری۔ فوری تاثر میں خواجہ مرحوم موردا الزام ٹھہرتے ہیں لیکن ذرا غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے اس دور میں جب یہ خاکے لکھے گئے تھے، برعظیم پاکستان و ہند کے مسلمانوں کی فکری قیادت کرنے والی اکثر شخصیات قادیانیوں کی بابت بہت نرم گوشہ رکھے ہوئے تھیں حتیٰ کہ علامہ اقبال جیسی صاحب بصیرت شخصیت بھی ان کے حق میں رطب لسان تھی۔ یہ بہت بعد میں ہوا کہ اقبال، علامہ انور شاہ کشمیری سے مکالمے کے نتیجے میں قادیانیت کی اصلیت سے آگاہ اور تائب ہوئے۔ لہذا تاخیری تاثر میں خواجہ حسن نظامی مرحوم رعایتی نمبروں سے خلاصی پاجاتے ہیں۔ اب اگر سوال اٹھتا ہے تو فقط اس تالیف کے پیش کار کی آنکھ چمولی کی بابت اٹھتا ہے کہ صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے نہیں جیسے اطوار اپنائے ہوئے ہیں۔ موصوف، تاریخی اعتبار سے ایسے دور میں ہیں جہاں امت کے اجتماعی ضمیر اور ریاستی قانون نے قادیانیت کو نہایت

صراحت سے خارج از اسلام قرار دیا ہے، تو پھر وہ غیر محسوس انداز میں ظفر اللہ اور ذوالفقار کی اسلام شناسی کی شہادت دے کر ضمیمے کے تھیلے میں سے بلی نکال کر، کس قسم کی ادبی خدمت سرانجام دینا چاہتے ہیں؟ بہتر تو یہ تھا کہ ڈاکٹر ابوسلمان صاحب sugar coated چھابڑی لگانے کے بجائے قادیانیت کی ”حقانیت“ کے حق میں مفصل کتب کی دکان سجاتے۔ ہم برملا کہیں گے کہ اس قسم کی نفسیاتی چھیڑ چھاڑ کا مقصد اگر مسلمانوں کی حساسیت کے گراف کو چیک کرنا ہے اور انہیں آہستہ آہستہ قادیانیت کی قبولیت کے لیے تیار کرنا ہے تو ڈاکٹر صاحب جیسے ”دورانہ پیشوں“ کو منہ کی کھانی پڑے گی۔

زیر نظر تالیف میں اللہ میاں کے خاکے کے بعد حسب توقع فرشتوں کا خاکہ ہے جس میں فرشتوں کے بارے میں ضروری معلومات دی گئی ہیں۔ اس کے بعد گناہ گاروں کے لیڈر شیطان کا خاکہ ہے جو کافی دلچسپ ہے، ملاحظہ کیجیے:

”فرشتوں کی ملکوت یونیورسٹی میں پرنسپل بن کر سبق پڑھا چکا ہے۔ ذات اقدس کی تجلیات جباری اور کبریائی میں فنا ہو کر منصور کی طرح انا اللہ (میں اچھا) ہوں، (انا من النار) میں آگ سے بنا ہوں! نعرے لگا چکا ہے۔ مگر کوئی مولوی اس وقت عالم وجود میں موجود نہ تھا جو اس کی انانیت کو سولی پر چڑھاتا، اس واسطے خدا نے اس کو خود سولی پر چڑھایا۔“ (غیر مرئی وجود: گناہ گاروں کے لیڈر شیطان کا حلیہ، ص ۱۰۳)

یہ درست ہے کہ مولوی حضرات انانیت کو سولی پر چڑھا کر ہی دم لیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اقبال نے انانیت کو خودی کا نام دے کر اپنی جان بچائے رکھی اور مولویوں کے تیر و تنگ کے آگے ’شکوہ‘ کر دیا۔ خواجہ صاحب بھی اکثر ادیبوں کی طرح مولوی پر وار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کے کئی خاکوں میں بے چارہ مولوی تختہ مشق بنا ہے، ملاحظہ کیجیے کہ طنز کے تیر کیسے شاہ نشانی پر لگے ہیں:

”ان کے والد صوفی تھے، خود ان کا دل بھی صوفی ہے مگر دل کے اوپر مولویت کا پردہ ڈالے رکھتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ مروت و خلوص سے پیش آتے ہیں۔ بہت کھانے کا شوق نہیں ہے اور اس لحاظ سے ان کی مولویت میں نقص ہے۔“ (علمائے کرام: مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۱۱۲)

”مزان میں غرور و تمکنت نہیں ہے، دیکھنے میں مولوی بھی نہیں معلوم ہوتے۔“ (علمائے کرام: مفتی کفایت اللہ، ص ۱۱۴)

”ملازموزی بھوپال میں رہتے ہیں۔ ان کے مضامین سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ کوئی مولوی ہیں مگر درحقیقت نئے زمانے کے ایک مہذب نوجوان ہیں۔“ (اردو کے ظرافت نگار، ص ۱۲۲)

”اگر امریکہ میں ہوتے تو فورڈ موٹر والے سے کوئی بڑا کارخانہ بناتے۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں، اس لیے جتنا کماتے ہیں اس سے زیادہ کھلا دیتے ہیں۔ ذہین ہیں، حرفتی سمجھ بہت اچھی ہے۔ کئی بچوں کے باپ ہیں، مگر کئی بیویوں کے شوہر نہیں ہیں، حالانکہ مولوی کے لیے یہ بہت عجیب ہے کہ وہ ایک ہی بیوی رکھتا ہو۔“ (تاجر: مولوی محمد ادریس ہاشمی، ص ۱۳۸)

”اگر ان کی ڈاڑھی لمبی ہوتی تو شاید وہ بھی مولویوں کی طرح فقط دعوت کھایا کرتے، کھلانے سے احتیاط کرتے اور مجرد بھی نہ رہتے بلکہ چار نکاح کرتے۔“ (میران اسمبلی و کونسل آف سٹیٹ: سر محمد یعقوب، ص ۱۶۵)

”اگر وہ انگریز ہوتیں تو لیڈی ونگٹن کی طرح مشہور ہوتیں اور ہندو ہوتیں تو مسز نیڈو سے زیادہ شہرہ آفاق مانی

جاتیں، مگر خدا کے فضل سے مسلمان ہیں اس لیے ان کی قوم دلوں میں تو ان پر فخر کرتی ہے مگر زبان سے کچھ نہیں کہتی کہ ایک تارک پردہ عورت کی تعریف کرے تو مولوی صاحب فتویٰ نہ دے دیں۔ جہاں آرانے ثابت کیا ہے کہ پردہ اٹھانے والی عورتیں ایسی ہو سکتی ہیں۔“ (رہنمایان ملک وقوم: بیگم میاں شاہ نواز، ص ۱۷۸)

مولوی محمد ادریس ہاشمی کے خاکے میں ”حال آں کہ مولوی کے لیے یہ بہت عجیب ہے کہ وہ ایک ہی بیوی رکھتا ہو“ کے بجائے اگر ایسا کہا جاتا کہ ”حال آں کہ مولوی ہیں“ تو کفایت لفظی کنائے کا لطف بھی دے جاتی۔ بہر حال! یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ خواجہ صاحب نے تیر برسوں سے قبل انہیں حقیقت کے زہر میں بھگو یا ہے، اب مولوی اگر سخت جان نکلے تو بے چارے خواجہ کا کیا قصور؟ بات مولویوں کی چل نکل ہے تو اسی رو میں ہم بر عظیم کے چند معروف علما کے خاکوں کی جھلکیاں پیش کیے دیتے ہیں:

”کفر کا فتویٰ دینے میں بڑی مہارت تھی۔ ایک شخص کو ایک گناہ کے عوض کئی کئی ہزار کے کفر کے فتوے دیتے تھے اور عجیب و غریب باریکیاں کفر سازی کی ان کے ذہن میں آتی تھیں“ (علمائے کرام: مولانا احمد رضا خان، ص ۱۰۹)

ہمیں تو ایسی ”کفر ساز مولویا نہ ہو“ نے قدیم ایتھنز کے مقنن ڈریکو کی یاد دلا دی ہے جس کے بارے میں طنزاً کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے قوانین روشنائی کے بجائے خون سے تحریر کیے تھے، مثلاً سبزی چوراہا اور توہین مذہب دونوں کے لیے موت کی سزا مقرر کی تھی۔ جب ڈریکو سے اس سنگ دلی کی وجہ پوچھی گئی تو اس نے جواب دیا کہ خفیف جرایم، سزائے موت ہی کے مستحق ہیں اور بڑے جرم تو ان کی سزا اس مجبوری سے مقرر کئی گئی کہ کوئی اور بڑی سزا ہونہ سکتی تھی۔ خواجہ حسن نظامی کو خدا کا شکر بجالانا چاہیے کہ مولانا اور ڈریکو ہم عصر نہ تھے، ورنہ باریک بین اور فریب نظر ل کر نجانبانے کیا قیامت ڈھاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کی مولانا احمد سعید دہلوی سے گاڑھی چھنتی تھی اس لیے وہ ان کے بارے میں یہاں تک کہتے ہیں: ”خلوت میں کچھ اور جلوت میں کچھ اور“۔ یہ تعریف ہے یا تنقیص؟ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ غالباً، جمعیت علما ہند کے ناظم کی حیثیت میں ان کی سیاسی حکمت عملی خواجہ صاحب کو ضرورت سے زیادہ ”بھا“ گئی ہے، تبھی تو وہ لکھتے ہیں:

”دل میں کچھ اور ہوتا ہے، کہتے کچھ اور ہیں۔... ان کی زندگی امیر معاویہ کے اصحاب سے مشابہ ہے اس لیے ایک نمونے کی زندگی ہے، کمان ایک طرف کھینچتے ہیں، تیر دوسری طرف چلاتے ہیں۔“ (علمائے کرام: مولانا احمد سعید، ص ۱۱۰)

تقریباً ہر معروف عالم دین سے خواجہ صاحب چونچ لڑاتے نظر آتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے مختلف ادوار (۱۹۲۲، ۱۹۳۶، ۱۹۴۳) کے تین خاکے، خاکہ نگار کی ان سے قلبی قربت اور میلان طبع کی غمازی تو کرتے ہی ہیں، لیکن مولانا آزاد کی ذات گرامی کے احترام سے بڑھ کر شاید ان کی انشا پردازی کی جولانی کا خوف ہے کہ خواجہ صاحب قلم کو پوری ہوش مندی سے حرکت میں لاتے ہیں، گو چوٹ کرنے سے باز نہیں آتے:

”تصویر کی طاقت، چیوٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی ہے... اگر ان کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو ایک دن کم بارہ مہینے سوتے رہیں، صرف ایک دن بیدار ہو کر کام کریں کیونکہ یہ کسی کام کو جلدی کرنے کے عادی نہیں ہیں... سرسٹینورڈ کرپس کے دل سے کوئی پوچھے تو یہ جواب ملے کہ ہندوستان میں گاندھی جی سیاسی درویش ہیں، جو ہر لال یورپ کی سیاست کا عکس ہیں کیونکہ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان سے کہتے ہیں، حال آں کہ نئے

زمانے کی سیاست میں یہ بات گناہ کبیرہ ہے۔ صرف مولانا ابوالکلام چالیس کروڑ باشندوں میں ایک ایسے ہندوستانی ہیں جو یورپ کی سیاست کو انگریزی نہ جاننے کے باوجود سمجھتے بھی ہیں اور اس کے دار کو بغیر ڈھال کے روکتے بھی ہیں اور مسکرا کر ایک تکلیف سنا سنا شتر حریف کے مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں ”عالمیاً کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوئی ہوگی، یہ انجکشن آپ کی بیماری کے لیے بہت ہی مفید ہے“..... ہوش سنبھالتے ہی مسلم لیگ کو سمجھ لیا تھا۔ ۱۹۰۸ میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان پر انھوں نے حسن نظامی کے ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا ”سب باتیں منظور ہیں باستثنائے شرکت مسلم لیگ“..... بہر حال مولانا ابوالکلام آزاد موجودہ ہندوستان کے لیے سیاسی سورج ہیں اور سیاسی چاند ہیں۔ ان کو سیاسی چراغ بھی کہا جاسکتا تھا، اگر دوسرے سیاسی چراغوں کو روشن کر سکتے، جس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔“ (رہنمایان ملک وقوم: مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵)

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر جناح کا خاکہ بھی قارئین کی نذر کر دیا جائے کہ آزاد و جناح کی تقابلی تصویر جو خواجہ حسن نظامی نے کھینچی ہے شاید کسی نگاہ میں بیچ جائے:

”ان کی سیاسی سمجھ مسلمان قوم میں سب سے زیادہ ہے۔ ان کے ہم نام محمد علی مرحوم اس گہری بات کو جانتے تھے اس لیے اپنے دور میں محمد علی جناح کے میدان میں نمایاں ہونے کی مزاحمت کرتے تھے۔ مگر ان کے جوہر نے ان کو ان کی زندگی ہی میں نمایاں کر دیا تھا اور ان کے چودہ نکات مرحوم نے بھی قبول کر لیے تھے.... مولانا ابوالکلام انگریزی جانتے ہوتے تو مسٹر جناح ہوتے اور مسٹر جناح عربی اردو جانتے ہوتے تو مولانا ابوالکلام ہوتے۔“ (رہنمایان ملک وقوم: مسٹر جناح کی صورت و سیرت، ص ۸، ۱۷۸، ۱۷۹)

مولانا محمد علی جوہر کے متعلق خواجہ صاحب کے ارشاد نے ہمیں اکسایا ہے کہ یہیں اسی مقام پر ان کے خاکے کی ایک جھلک دکھائی جائے:

”قیامت تک زندہ رہیں گے مگر قیامت کے پورے نہیں سمیٹیں گے..... وہ بڑے وضع دار ہیں۔ جس سے جو برتاؤ شروع ہو جائے تو آخر دم تک ناپنے کا خیال رکھتے ہیں اور یہی جوہر اصلی مشرقی میں ہونا چاہیے“ (رہنمایان ملک وقوم: مولانا محمد علی، ص ۱۸۷)

اصلی مشرقی کہہ کر شاید علامہ عنایت اللہ مشرقی پر چوٹ کی گئی ہے۔ چون کہ زیر نظر تالیف میں علامہ کا خاکہ نہیں ہے اس لیے اس چوٹ کے زخم پر نمک چھڑکنا یا مرہم لگانا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ لہذا چوٹ قیاس کر لینا ہی کافی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے بھائی مولانا شوکت علی کا خاکہ، جہاں ان کی سادگی کا آئینہ دار ہے وہاں بر عظیم میں انگریز کے خلاف تحریک آزادی میں ان کے سیاسی کردار کو بھی اجاگر کرتا ہے:

”ایک زمانے میں پورے صاحب بہادر تھے اب پورے وحشی مسلمان ہیں۔ شوکت علی نہ ہوتے تو محمد علی کا کام ادھورا رہتا۔ مگر بعد کے تجربے سے معلوم ہوا کہ شوکت علی جیسا آدمی مسلمانوں میں پیدا نہ ہوتا تو مہاتما گاندھی کی شخصیت بھی ناقص رہ جاتی..... وہ بولنے میں بونگے اور غیر مدبر معلوم ہوتے ہیں..... سرسری بات چیت سے آدمی خیال کرتا ہے کہ وہ مہذب و سنجیدہ نہیں ہیں، لیکن کچھ دیر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سنجیدگی کی تہہ میں جو خود پسندی ہوا کرتی ہے اس کو مٹانے کے لیے وہ غیر مہذب باتیں کرتے ہیں..... انگریزوں میں آج کل قوت پر بھروسہ کرنے

والے بہت ہیں، اپنی ذات و خصلت کی خوبی پر اعتماد کرنے والا کوئی ہوتا تو شوکت علی اس قدر نہ چمکنے پاتے.....
 اگرچہ آج کل وہ جیل خانہ میں ہیں مگر ہندوستان کے بچے بچے کو انہوں نے اپنا اسیر بنا رکھا ہے“ (رہنمایان ملک و قوم: مولانا شوکت علی، ص ۱۸۱، ۱۸۲)

دو مختلف جہتوں میں رواں دواں دو مختلف لفظوں (جیل خانہ، اسیر) کی معنوی تکرار، سلاست کے ساتھ ادبی شان لیے ہوئے ہے اور اس تاریخی حقیقت کی ترجمانی کر رہی ہے کہ آزادی کی تحریک میں سرکاری جیلوں کے اسیر، ہمیشہ سے جیل سے باہر کے پورے سماج کو اسیر بنائے رکھتے ہیں۔ رہی اس فقرے کی بات کہ ”انگریزوں میں آج کل قوت پر بھروسہ کرنے والے بہت ہیں، اپنی ذات و خصلت کی خوبی پر اعتماد کرنے والا کوئی ہوتا تو شوکت علی اس قدر نہ چمکنے پاتے“، خواجہ صاحب قاری کو گولمگو میں مبتلا کر جاتے ہیں اگرچہ انگریز کو واضح طور پر بری طرح لتاڑتے ہیں لیکن شوکت علی کے ساتھ وہی کچھ کر گئے ہیں جو انہوں نے مولانا احمد سعید کے بارے میں کہا ہے کہ ”کمان ایک طرف کھینچتے ہیں اور تیر دوسری طرف چلاتے ہیں۔ کیا خیال ہے کہ خواجہ صاحب کے ترکش سے نکلا ہوا تیر شوکت علی کی ”اسیری پر قائم ہیر و شپ“ کے غبارے سے ہوا نکال نہیں دیتا؟ زیر نظر تالیف میں مولانا حسرت موہانی کا خاکہ، ان کے ایثار، خلوص، حب الوطنی اور بے لوث کردار کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے، ملاحظہ کیجیے:

”پستہ قد، گداز جسم، گندمی رنگ، گول چہرہ، لمبی ڈاڑھی، آنکھیں بڑی بڑی، آواز عورتوں کی طرح نازک اور گوش نواز، جلدی جلدی گھبرا گھبرا کر بولتے ہیں، تیز چلتے ہیں، جس شہر میں جاتے ہیں وہاں کے ہر اچھے برے ملکی کام کرنے والے سے ملتے ہیں۔ صبح سے شام تک سڑکوں، گلیوں اور عام راستوں پر ان کے پیچھے دوڑتے دوڑتے ہی آئی ڈی والے سپاہی پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں اور دل ہی دل میں ان کو اور اپنے خفیہ محکمہ کو گالیاں دیتے ہیں مگر یہ خدا کا اتنی بندہ ذرا نہیں تھکتا اور پکھے کی طرح برابر گردش میں رہتا ہے..... جیل خانہ گئے، گھر نیلام ہوا، پریس ضبطی میں آیا، چکیاں پیسیں۔ مگر جب رہا ہو کر گھر پہنچے تو پھر وہی گناہ گاری کی باتیں کرنے لگے، معصوم لوگوں کا دل دکھانے لگے..... مہاتما گاندھی نے ان کو خطی کا خطاب دیا ہے اور اس میں کچھ شک بھی نہیں کہ ان کی ملکی محبت کا شوق خط کی حد تک پہنچ گیا ہے..... چالاک لیڈر آگے بڑھ گئے اور یہ غرارے دار پاجامہ پہننے والا جو تیاں چٹختا پیچھے چلتا رہ گیا، کیونکہ اس کو خفیہ آدمی میسر نہ تھے جو دلالوں کی طرح اس کو بڑا آدمی بڑا آدمی ہر جگہ کہتے پھرتے“ (رہنمایان ملک و قوم: مولانا حسرت موہانی، ص ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱)

تعب ہے کہ اس زمانے میں بھی قایدین ”خفیہ اداروں“ کے پروردہ تھے، آج کل تو خیر سے خفیہ ہاتھ کی مدد کے بغیر قیادت ہو ہی نہیں سکتی۔ مہاتما گاندھی زمینی حقائق کے مطابق پینترے بدلنے میں اپنا عانی نہ رکھتے تھے، شاید اسی لیے مولانا کا آئیڈیل ازم ان کی نظر میں خبط ٹھہرا ہے۔ خود گاندھی بھی خط سے مبرا نہیں تھے لیکن ان کے خبط کی نوعیت بہت مختلف تھی، خواجہ حسن نظامی کی زبان سے ہی سنئے:

”ان میں ذہنی اور دماغی تدبر اور دور اندیشی کی بہت کمی ہے مگر یہ عیب ان کے خداداد جو ہر صداقت و استقلال کی چادر میں چھپا رہتا ہے..... وہ توحید و رسالت کا علی الاعلان اقرار کرتے ہیں مگر ہندو ہونے کے فخر کو آخر تک ہاتھ سے نہیں دیتے..... گاندھی جی کی جیب عمر و عیار کی زینیل ہے کہ بڑے بڑے موٹے موٹے آدمی ان کی جیب میں آ

جاتے ہیں اور وہ خود بھی چھوٹی سے چھوٹی جیب کے اندر سا جاتے ہیں۔“ (رہنمایاں ملک و قوم: مہاتما گاندھی، ص ۱۸۴، ۱۸۵)

مطلب یہ ہوا کہ آنجناب گاندھی اپنے ہندو ہونے کے فخر کے خبط میں ایسے مبتلا تھے کہ دیکھی ان دیکھی اور سنی ان سنی کر دیتے تھے۔ باقی رہی بات، بڑے بڑے موٹے موٹے آدمیوں اور گاندھی کی جیب کی، تو تاریخی قرائن بتاتے ہیں کہ صرف مولانا شوکت علی مرحوم ہی ماشاء اللہ اتنے کچھ شیم تھے کہ گاندھی کی جیب چوہے کے بل کا منظر پیش کرتی ہوگی، تھی تو موصوف چھوٹی سے چھوٹی جیب میں سما جاتے ہوں گے۔ اب ذرا ذائقہ بدلنے کے لیے چند ایسے خاکوں پر نظر ڈالتے ہیں جن میں خوب حسن نظامی، نیم رضا مندی سے کمان گلے میں لڑکا کر قلم سنبھالے دکھائی دیتے ہیں:

”ان کے ڈراموں سے ان کے ذوق کی بلندی ہفت افلاک تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ آنے والے ہندوستانی ان کو ٹیکسیر سے زیادہ اونچے درجے پر بٹھائیں گے لیکن وہ ہندو ہوں گے کیوں کہ مسلمان یہی سوچتے رہ جائیں گے کہ ڈرامہ نویس کی عزت اور قدر کرنی چاہیے ہے یا نہیں؟“ (آغا حشر، ص ۱۱۹)

”اردو کے حوصلہ مند اور بہادر سپاہی، ان کی تحریر ہندی روڑوں کے لیے سڑک دبانے کا ٹیلن ہے..... ان کے کرکٹسٹریک ٹھیک تعریف یہ ہے کہ یہ گنبد کی آواز ہیں کہ جیسی کہو ویسی سنو“ (مدیران اخبارات و رسائل: سید بقائی، ص ۱۲۳)

”ان کے عقائد وہابی ہیں مگر انہوں نے لقب صوفی رکھا ہے“ (مدیران اخبارات و رسائل: مولانا سالک، ص ۱۲۲)

”قادر الکلام ہیں مگر قادر المزمز۔ آج نہیں ہیں۔ بھک سے اڑ جانے والی ایک قسم کی انسانی بارود ہیں.....“

قادیانی ہوتے تو اپنی بے نظیر اور دل و دماغ پر نقش ہو جانے والی نظموں کو وحی اور الہام کہتے۔ ہندو ہوتے تو کسی بھیکو کو کجوں نہ رہنے دیتے، انگریز ہوتے تو برٹش قوم کا شاہ خرچی سے دیوالا نکال دیتے“ (مدیران اخبارات و رسائل: مولانا ظفر علی خاں، ص ۱۲۵)

”والیان ریاست کی طرح زیادہ سوتے ہیں۔ ہندوؤں کی طرح کفایت شعار نہیں ہیں“ (مدیران اخبارات و رسائل: محقق شوکت علی فہمی، ص ۱۲۶)

”باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے مزاج میں بچوں کا سا بھولپن ہے“ (لقمان الملک حکیم نابینا صاحب، ص ۱۳۳)

”کانوں سے ذرا کم سنتے ہیں اس لیے جب کسی سے بات کرتے ہیں تو اس کو بہرا سمجھ کر آواز سے بولتے ہیں“ (ڈاکٹر سید سجاد، ڈبلیو، ص ۱۳۳)

”ان کے دل کی بات اور روپیہ جمع کرنے کے مقصد کو سوائے ان کے دوسرا دنیا میں کوئی بھی نہیں جانتا“ (ریاست حیدرآباد کن: حضور نظام، ص ۱۳۹)

”اردو اور انگریزی کے بہت ماہر مضمون نگار ہیں۔ اگر وزیر اعظم نہ ہوتے تو کسی سرکار پسند اخبار کے ایڈیٹر ہوتے“ (نواب قاضی سر عزیز الدین احمد، ص ۱۵۷)

”حد شرع کے اندر رہ کر عقد کرنا امرائے قدیم کی ایک وضع تھی، یہ بھی اسی پر عمل کرتے ہیں اور ستر برس کی عمر میں بھی ان کے عقد کی خبریں سنی جاتی ہیں“ (نواب سر امیر الدین احمد، ص ۱۵۹)

”مچھلی کی طرح ان کے خیالات کبھی دریا کی تہ میں جاتے ہیں اور کبھی دریا کی سطح پر اچھلنے لگتے ہیں۔ اگر یہ اسمبلی

تعصب سے اعلیٰ و برتر ہیں، البتہ بعض اوقات دل ہی دل میں اپنی عقل پر تعلیٰ کرنے لگتے ہیں۔ (ممبران اسمبلی و نولس آف سٹیٹ: میاں سرفضل حسین، ص ۱۶۴)

سرفضل حسین، ہندوؤں میں متعصب کیوں مشہور تھے اس کی ایک وجہ ہم بیان کیے دیتے ہیں۔ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں مانٹیگلو چیسفورڈ آئینی اصلاحات کی سکیم نافذ کی گئی۔ حال آں کہ یہ مسلمانوں کے حقوق ملحوظ رکھتے ہوئے نہیں بنائی گئی تھی، لیکن اس کے تحت مسلمانوں کو خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ اس سکیم کے تحت پنجاب کے پہلے وزیر تعلیم سرفضل حسین (۱۹۲۶-۱۹۲۱) نے انتظامی اقدامات کے ذریعے سرکاری تعلیمی اداروں میں مسلمان طلباء کے ۴۰٪ داخلوں کو یقینی بنا دیا۔ اس وقت پنجاب کی مسلم آبادی ۵۵٪ تھی، اس لحاظ سے یہ ایک معتدل اور قدرے معذرت خواہانہ قدم تھا، مگر اس پر بھی ہندوؤں نے ہر مرحلے پر اسے سختی سے چیلنج کیا۔ خیال رہے کہ اس وقت پنجاب یونیورسٹی اور اس سے ملحق ادارے غیر مسلم کنٹرول میں تھے اور انہیں اکثر غیر مسلم مفادات کے لیے ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ یہاں یہ بیان کرنا بھی بر محل ہوگا کہ اس وقت کے برطانوی ہندوستان میں صرف پنجاب ہی واحد مسلم اکثریتی صوبہ تھا۔ بنگال میں مسلمان بمشکل ہندوؤں کے برابر تھے۔ ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال کے تحت مشرقی بنگال اور آسام پر مشتمل مسلم اکثریتی صوبہ وجود میں آیا تو ہندوؤں نے اس پر خوب واویلا کیا اور ۱۹۱۱ء میں تقسیم کی تینخ کرا کے ہی دم لیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو خواجہ حسن نظامی ابوارڈ دیا جانا چاہیے، اگرچہ کافی تاخیر ہوگئی ہے لیکن بعد از مرگ، دیر آید درست آید کے مصداق ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن قبل از قیامت کی شرط بھی ضروری ہے۔ قارئین حیران ہو رہے ہوں گے کہ ہم اتنی شد و مد کے ساتھ ڈاکٹر ذاکر مرحوم کو ابوارڈ دینے کی وکالت کیوں کر رہے ہیں، لیجئے خود ہی فیصلہ کیجیے:

”ڈاکٹر ذاکر حسین دوصدی پہلے پیدا ہو جاتے تو ہماری سلطنت غارت نہ ہوتی۔ وہ سلطنت قائم کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہندوستانوں کو انسان بنانے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ اگر عمر کا منتقل کرنا ممکن ہوتا تو میں اپنی زندگی کے پانچ مہینے ان کو دے سکتا تھا، زیادہ نہیں کیوں کہ میں فضول خرچی کو برا سمجھتا ہوں“ (ڈاکٹر ذاکر حسین، ص ۱۳۵)

حیرت ہوتی ہے کہ خواجہ صاحب غلامی کے دور میں بھی برطانوی پارلیمانی نظام کو اچھی طرح سمجھتے تھے، جب کہ اچھے اچھوں کو آزادی کے بعد بھی (بلکہ ابھی تک) اس کی الف ب پلے نہیں پڑی۔ مولوی تمیز الدین کیس میں خواجہ صاحب کا درج ذیل خاکہ پیش کیا جاتا تو شاید ”مامانج“ درست فیصلہ کر پاتا:

”ان کی حکومت کے اراکین سب کام ان کے نام پر کرتے ہیں اور دنیا کو بے علم سمجھتے ہیں کہ سارا اختیار شہنشاہ خارج کے ہاتھ میں ہے۔ حال آں کہ سب اختیار اراکین حکومت نے آپس میں بانٹ لیے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھر کے دادا جان ایک بڑے پلنگ پر درمی چاندنی بچھائے گا و تکیے سے لگے بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف ان کے بیٹے پوتے جمع ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ ایک کروڑ کے ہوائی جہاز خرید لو، بادشاہ سلامت کا ارشاد ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ فلاں قوم کے ہتھیار چھین لو، بادشاہ سلامت حکم دیتے ہیں۔ تیسرا کہتا ہے، حضور جہاں پناہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہندوستان ابھی مکمل آزادی کے قابل نہیں ہوا ہے۔

بادشاہ سلامت سب کی باتیں سنتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ نہ میں نے ایک کروڑ روپے کے ہوائی جہاز خریدنے

کے لیے کہا، نہ میں نے کسی قوم کو ہتھیاروں سے محروم کرنے کا حکم دیا اور نہ میرا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی آزادی کے لائق نہیں ہیں! مگر یہ میری اولاد کی کسی گستاخ اور دلیر ہے کہ میرے ہی سامنے جھوٹ بولتی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ میری ساری رعایا آزاد ہو، میری ساری رعایا امن پسند ہو، میری ساری رعایا عیش میں ہو، میں کچھ چاہتا ہوں یہ کچھ کہتے ہیں! پھر بھی غنیمت ہے کہ انہوں نے مجھے گاؤں تک سے لگا کر بٹھا تو رکھا ہے“ (شہنشاہ جارج پنجم کا حلیہ، ص ۱۴۳)

جارج پنجم کے اس خاکے میں نہایت لطیف کنائے میں جمہوریت پر چوٹ بھی کی گئی ہے اور بادشاہت کی وضع دار صفات کی عقده کشائی بھی۔ ذرا غور کیجیے کہ جب شہنشاہ ہر پہلو سے اپنی ”رعایا“ کی بہتری کا خواہاں ہے تو پھر آخر رعایا کے نام پر اقتدار سنبھالنے والے رعایا کا جینا کیوں حرام کیے ہوئے ہیں؟۔ یہ سوال آج بھی اتنا ہی جواب طلب ہے جتنا خواجہ مرحوم کے دور میں تھا۔ زیر نظر تالیف میں ایک بہت دل چسپ خاکہ، خواجہ صاحب کی مشاہداتی حس کی بھرپور نمائندگی تو کرتا ہی ہے مگر اس کے ساتھ کسی مکروہ حقیقت کو انتہائی مناسب الفاظ میں ڈھال کر سماجی خمیر کو کچھ کے لگانے کے فن کی نیو بھی رکھتا ہے، بغور پڑھیے:

”ٹھکانا قدر جیسے ورزش کا مگدر، موٹا بدن، جیسے ڈنلاپ ٹائری کی اشتہاری تصویر، رنگ نہ گورا نہ کالا، نہ گندی نہ سانولا، نہ پھیکا نہ بیٹھا، نہ کڑوا نہ کسلا، بلکہ کالے سفید تلوں کی ملی ہوئی بھوسی کی رنگت ہے۔ چہرہ سلولائٹ ساخت کے کھولوں سے مشابہ ہے، نہ گول ہے نہ کتابی۔ دیکھنے میں انسانی صورت ہے مگر فرشتوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی نہیں بلکہ شدا نے اپنی بہشت بناتے وقت کسی کہار سے بنوائی ہوگی۔ آنکھیں مگر چھ کی طرح چھوٹی چھوٹی، زمین کی طرف جھکی ہوئی۔ گردن صراحی دار نہیں ہے، نہ لمبی ہے بلکہ بہت کوتاہ ہے۔ پیشانی کنجوس کا دل ہے۔ بولنے کا ڈھنگ نہ چینی ہے نہ جاپانی، ایرانی ہے نہ تورانی۔ جب بولتا ہے تو الفاظ منہ سے اس طرح اچھل اچھل کر، ابل ابل کر، چیخ چیخ کر باہر گرتے ہیں جیسے مکئی کے دانے بھاڑ سے بھن بھن کر باہر گرا کرتے ہیں یا جیسے ربڑ کی پیکاری سے چبھی قلم میں روشنائی کے قطرے پکائے جاتے ہیں۔ ازل کے دن جب خندہ پیشانی تقسیم ہو رہی تھی تو یہ ذرا سو گیا تھا اس لیے اس کا منہ ہر وقت غصہ سے سوجا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اپنی عارضی چند روزہ نوکری کی خاطر سے کبھی مسکرا نا چاہتا ہے تو اجالے میں اندھیرا ہو جاتا ہے اور کاینات کی زندہ دلی سہم کر چھپ جاتی ہے۔ چلتا ہے تو مکھنے ہاتھی یا ارنے پھینے کی طرح جھومتا ہوا چلتا ہے اور فارسی کا یہ مصرع پڑھنا پڑتا ہے کہ

مردم بیاں طرز خرامیدان تو!

عمر چالیس سال سے زیادہ ہے اور خود اس کے کان میں کہا کرتی ہے کہ

”چہل سال عمر عزیزت گزشت مزاج تو از حال طفلی نہ گشت“

تین ہزار روپے ماہوار کما تا ہے مگر تین پیسے ماہوار کی حیثیت میں دکھائی دیتا ہے۔ آدمی ہے مگر آدمیت سے محروم۔ ہندوستانی ہے لیکن اگر اس کے سارے جسم کو کھرچ ڈالا جائے تو تین ماشے چاررتی ہندوستانی بھی اندر سے نہ نکلے گی مگر نخوت، تکبر، خود پسندی، بے رحمی، مردم آزاری کے برادے کا ایک انبار پایا جائے گا۔ اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے مگر اسلامی نام سے نفرت کرتا ہے اور مسلمانوں کو ستانے اور نقصان پہنچانے میں اس کو مزہ آتا ہے۔ نماز پڑھنے والوں کو مکار، روزہ رکھنے والوں کو احمق، زکوٰۃ دینے والوں کو فضول خرچ، حج کرنے والوں کو عقل باختہ تصور کرتا ہے۔

اپنی ساری زندگی میں کبھی کسی مسلمان کو فائدہ پہنچانے کا گناہ نہیں کیا۔ صبح سے شام تک سوچتا رہتا ہے کہ مسلمانوں کو کیوں کر نقصان پہنچائے!“ (نئی روشنی کا فرعون: ایک سرکاری آفیسر، ص ۱۶۹، ۱۷۰)

خیال رہے زیر نظر تالیف میں دہلی کے ایک کمشنر، دو ڈپٹی کمشنرز اور دو مجسٹریٹس کے خاکے بھی شامل ہیں۔ خواجہ صاحب نے ان سبھوں کے اخلاق اور کام میں پختگی کی تعریف کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرکاری آفیسر کا جو خاکہ ابھی آپ نے ملاحظہ کیا، کسی بیوروکریٹ کا نہیں بلکہ عام چھوٹے موٹے افسر کا ہے۔ ہمیں خواجہ صاحب کی خوش قسمتی پر رشک آ رہا ہے کہ ان کے دور میں کم از کم اعلیٰ سرکاری افسران تو با اخلاق اور عوام کے لیے بے لوث کام کرنے والے تھے، ان کی بدولت نچلے افسران بھی کچھ نہ کچھ عوامی انداز اپنالیتے ہوں گے۔ جب کہ ہمارے زمانے میں بیوروکریٹس، ذہنی اعتبار سے اتنے پست ہو چکے ہیں کہ خاکہ پڑھ کر سب سے پہلے انہی کی طرف دھیان جاتا ہے۔ چلیں! یہ تو ہو گیا آج کے بیوروکریٹ کا خاکہ، سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کے عام سرکاری افسر کا خاکہ کس کا قلم کھینچے گا؟

خواجہ صاحب نے ایک مثالی جوڑے کا خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ اس جوڑے کی داخلی دنیا کیسی تھی، اس سے ہمیں زیادہ تعرض نہیں کرنا چاہیے، ویسے خواجہ مرحوم نے خانگی امور کی عمدگی کی بابت بھی دو چار اشارے کیے ہیں، لیکن اس جوڑے کا جو روپ دنیا کے سامنے تھا، بلاشبہ قابل تعریف اور بے مثال تھا۔ دیکھیے خواجہ نے کتنے دل نشین پیرائے میں خامہ فرسائی کی ہے:

”بولتے ہیں تو چہرے کے اعصاب کی حرکات میں موسیقی کے پردوں کی جنبش پیدا ہو جاتی ہے اور دل کا مطلب ایک عمدہ شعر کی صورت بن کر ان کے چہرہ پر آ جاتا ہے..... فرشتوں نے پیرس کی مٹی سے ان کا تپلا بنایا ہوگا اور دہلی اور لکھنؤ کی خاک سے رنگ آمیزی کی ہوگی“ (رہنمایان ملک وقوم: مسٹر آصف علی، ص ۱۷۱)

”عورت کا غرور، عورت کی ضد، عورت کی خود پسندی، عورت کی نازک مزاجی سے کوسوں دور ہیں، اس لیے عورتوں کے روپ میں مرد ہیں۔ مرد کی بے وفائی، مرد کی خود غرضی، مرد کی حاکمیت، مرد کی تلون مزاجی نہیں ہے، اس لیے اصلی اور خالص عورت ہیں“ (رہنمایان ملک وقوم: بیگم آصف علی، ص ۱۷۶)

ہمیں تو ریاست رام پور کے حکم ران کا خاکہ پڑھ کر وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف یاد آ گئے جنہیں یار لوگوں نے ”بلڈ پریشر وزیر اعلیٰ“ کا خطاب دے رکھا ہے کہ نہ خود آرام کرتے ہیں اور نہ ہی کام میں ہر وقت جتنے ہوئے معصوم بیوروکریٹس کے آرام کا خیال کرتے ہیں۔ شاید تاج دار رام پور کی روح وزیر اعلیٰ شہباز شریف میں حلول کر گئی ہے، ملاحظہ کیجیے:

”ایک بڑی سڑک بنانے کا حکم دیا کہ آٹھ روز میں تیار ہو جائے! حال آں کہ وہ آٹھ مہینے میں تیار ہونے کے لائق تھی۔ یہ حکم دیتے ہی انہوں نے محمود تیور کی طرح کام کی یلغار شروع کر دی اور آٹھ دن مسلسل کام کرتے رہے اور خود اپنی ذات کا آرام ترک کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سڑک آٹھ روز میں تیار ہو گئی“ (ریاست رام پور: تاج دار رام پور، ص ۱۵۳)

لیکن رام پور کے تاج دار ایک لحاظ سے ہمارے وزیر اعلیٰ پر کافی بھاری ہیں۔ ظاہر ہے اتنا مستعد بندہ جسمانی اعتبار سے بھاری نہیں ہو سکتا، اس لیے وہ کم از کم وزن میں تو بھاری نہیں ہیں، وہ بھاری ہیں تو صرف اور صرف اپنی صفت مردم شناسی میں۔ ان کے مقرر کردہ پولیٹیکل منسٹر کا خاکہ کافی متاثر کن ہے۔ ایک دو سطریں نمونے کے لیے حاضر ہیں:

”دنیا میں جو دماغی اور ذہنی تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان کو اس طرح سمجھتے ہیں یا سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں گویا قدرت نے ان کو اسی کام کے لیے بنایا ہے“ (انتظامیہ رام پور: زیدی صاحب، ص ۱۵۴)

گویا بیسیویں صدی کے پہلے نصف میں دنیا کی سطح پر جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں موصوف کی ان پر گہری نظر تھی، حال آں کہ اس دور کی دنیا گلوبل ولیج بننے سے کوسوں دور تھی، اس لیے گہری کے بجائے سرسری نظر سے بھی کام چل سکتا تھا۔ جب کہ ہمارے وزیر اعلیٰ کی ٹیم اکیسویں صدی کے پہلے عشرے کے تقریباً اختتام پر، گلوبل ولیج کو بیسیویں صدی کے آغاز کی دنیا تسلیم کیے ہوئے ہے۔ کاش! زیدی صاحب کی روح بھی کسی ”بٹ“ میں حلول کر جاتی۔

بر عظیم کی مسلم ریاستوں کے زوال میں مسلم حکم رانوں کے لچھن کس حد تک ذخیل تھے، اس کی ایک جھلک خواجہ حسن نظامی نے ریاست مانگروں کے نواب جہانگیر میاں کے توصیفی خاکے میں جملہ معترضہ کے طور پر پیش کی ہے:

”ان کی ریاست جو ناگڑھ کے برابر ہوتی تو ہندوستان کے ہر صوبے میں ایک قومی یونیورسٹی اپنے خرچ سے بنا دیتے اور جو ناگڑھ کی طرح کٹوں میں روپیہ برباد نہ کرتے“ (ریاست مانگروں: نواب صاحب مانگروں، ص ۱۵۶)

اب ہم حصہ سوم کے خاکوں کا جائزہ لیتے ہیں جنہیں ’تصویر خصائل: ایک نفسیاتی مطالعہ‘ کا نام دیا گیا ہے۔ انگریزوں کو خواجہ مرحوم نے قریب سے دیکھا تھا اس لیے ان کا خاصا دل چسپ اور ذہنی بر حقیقت خاکہ سپرد قلم کیا ہے:

”وہ دہتا ہے تو چیوٹی بن کر کاٹتا ہے، دباؤ سے نکلتا ہے تو بھی ہاتھی بن کر سوئٹ ہلاتا ہے..... اس کو جاہل اور بے عقل آدمیوں سے ایسا کام لینا آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے..... تجارتی مال دکانوں پر سجانے اور ان کے پارسلوں کو عمدہ بنا کر بیچنے میں کمال حاصل ہے“ (قومی خصائل: انگریز کے خصائل، ص ۱۹۵)

خواجہ صاحب نے یہ جو فرمایا ہے کہ ”اس کو جاہل اور بے عقل آدمیوں سے ایسا کام لینا آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے“، ہمارے لیے حیرت انگیز نہیں ہے۔ کیوں کہ ہم اس آفاقی سچ سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہر انسان کے اندر ’عزت نفس‘ نامی ایک میٹر لازماً لگا ہوتا ہے چاہے وہ جاہل ہو یا عالم۔ اس لیے جس انسان سے کام لینا مقصود ہو، اگر اس کی عزت نفس کو مسلسل ملحوظ رکھا جائے تو ایسا واقعہ استثنائی ہوگا کہ انسان بھر پور لگن، دل جمعی اور دیانت داری سے کام نہ کرے۔ خواجہ صاحب کی حیرت بھی بجا ہے کیوں کہ مسلم سوسائٹی میں، چاہے وہ ان کے زمانے کی ہو یا ہمارے عہد کی، سرے سے عزت نفس کے وجود سے ہی انکار کیا جاتا ہے چہ جائے کہ اس کا احترام کیا جائے۔ اب ذرا ہندو کے خصائل دیکھ لیجیے:

”روپے کے معاملے میں بڑا ہوشیار، پتھر میں چونک لگانے والا، سود لینے میں بے رحم اور ہر سچائی کو چھوڑ سکنے والا ہے..... ہندو کو کیمیا آتی ہے مگر اس کیمیا کے شوق سے بھاگتا ہے جہاں کچھ خرچ کرنا پڑے“ (قومی خصائل: ہندو کے خصائل، ص ۱۹۶)

مسلمان کے خصائل سپرد قلم کرتے ہوئے خواجہ صاحب کا قلم ڈگمگایا نہیں، دیکھیے ذرا:

”لمبی ڈاڑھی، مونچھ کتڑی ہوئی اور آج کل ڈاڑھی منڈوائے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ پہلے ہندوستان کا حاکم تھا اب انگریزوں اور ہندوؤں سے حکومت مانگا کرتا ہے اور قدیمی ہمت کو بھول گیا ہے۔ مذہب کا دیوانہ ہے۔ فرہاد سے زیادہ عقیدے کو شیریں سمجھتا ہے۔ مذہب کی معمولی بات پر جان دے ڈالتا ہے۔ بڑا بھولا ہے، ملائی کی رکابی چرا کر لے لو اور اس کے بدلے دھکی ہوئی روٹی رکھ دو مگر ذرا تعریف کر لو تو روٹی کو ملائی تسلیم کر کے روکھی روٹی اس کو لگا کر کھا لیتا ہے“ ”کھڈال مال دھن کو، کوڑی نہ رکھ کفن کو“ اس کا مقولہ بھی ہے اور اسی پر اس کا عمل بھی ہے ایک روپے کی آمدنی ہو تو ایک سو روپے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ عورتوں اور سود خواروں سے تعلق پیدا کرنا اس کی عادت ہو گئی ہے۔..... سیاسی

عقل کم زور ہے۔ تاج و تخت لینے کی بات ہو تو مسجد کے سامنے نفیری بند کرانے کو اپنے لیے کافی سمجھ لیتا ہے اور تاج کی پرواہ نہیں کرتا۔ دنیا میں سب سے بڑا فضول خرچ مگر سب سے بڑا شجاع ہے۔ آج کل اس کو غصہ جلدی آجاتا ہے اور غصہ پی جانے کا قرآنی حکم یاد نہیں کرتا۔ اس کو مولوی اور سیاسی لیڈر بہت جلدی گرفتار کر سکتے ہیں اس لیے چالاک لوگ مذہب کا نام لے کر اس کو احق بناتے رہتے ہیں“ (قومی خصایل: مسلمان کے خصایل، ص ۱۹۶، ۱۹۷)

خواجہ صاحب کو انگریز پر حیرت تھی لیکن ہمیں مسلمان پر حیرت ہے کہ مثلون اشتعالی نفسیات کا مظاہرہ کرنے میں اتنا زیادہ ”مستقل مزاج“ واقع ہوا ہے کہ استقلال کو اس پر رشک آتا ہے (اگر استقلال موٹن ہوتا تو رشک کے بجائے حسد کرتا)۔ کئی عشروں کے بعد بھی اور زمینی حقائق میں انقلابی تبدیلی کے باوجود بھی مسلمان کے خصایل میں بہتری رونما کیوں نہیں ہوئی، اس کا جواب خواجہ مرحوم کے اسی خاکے میں مل جاتا ہے کہ ”اس کو مولوی اور سیاسی لیڈر بہت جلدی گرفتار کر سکتے ہیں اس لیے چالاک لوگ مذہب کا نام لے کر اس کو احق بناتے رہتے ہیں“، مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ مسلمان کی راہنمائی کر کے صورت حال کو بہتر کر سکتے ہیں درحقیقت وہی لوگ اپنے مخصوص مفادات کے تحفظ کی خاطر اسے ذہنی پستی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ جب سکھوں کی بات ہو اور کوئی لطیفہ پیش نہ کیا جائے تو اسے بھی لطیفہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب نہایت لطافت سے ”سکھ کے خصایل میں خاکے کے تقاضے نبھائے گئے ہیں:

”جسم مضبوط، دل قوی، مزاج کا ضدی، بات کا پورا، اس کو جس پہلو سے الٹو ہر رخ سے سکھ نظر آتا ہے..... اس کی عقل جان بل کی طرح ذرا موٹی ہے مگر اس کی جرات کو دیکھ کو سب اس کی عقل کو نازک اندام کہنے لگتے ہیں“ (قومی خصایل: سکھ کے خصایل، ص ۱۹۷)

پنجاب کے دریاؤں سے اٹھتی، اس کی زمین سے وابستہ ”پنجابی“ کی تعریف و تنقیص ملاحظہ کیجیے:

”پانچ دریاؤں کی زمین میں رہنے کے سبب اس کا خیال بھی پانی کی طرح پتلا ہو جاتا ہے جس میں نئی بات اور نئے عقیدے کا رنگ فوراً مل جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو نئی تحریکیں ملک میں پیدا ہوتی ہیں ان کو سب سے زیادہ پنجاب میں مقبولیت ہوتی ہے۔ پنجابی کی محنت و جفاکشی نے اس کو بنگالی کی ذہانت پر غالب کر دیا ہے۔ وہ دنیا کے ہر ملک اور ہندوستان کے ہر مقام میں موجود ہے اور ہر کام میں اس کا دخل ہے۔ مگر دریا کی طرح اس کی خصلت میں اتار چڑھاؤ جاری رہتا ہے“ (وطنی خصایل: پنجاب والہ کے خصایل، ص ۱۹۸، ۱۹۹)

یوپی کے لوگوں کے خصایل بھی خواجہ صاحب نے خوب پیش کیے ہیں:

”نازک اندام، نازک خرام، عقل کا پتلا، کام چور، محنت کو خلاف انسانیت سمجھنے والا۔ سازش میں کامل، ظاہر داری کا بادشاہ، ذکاوت و ذہانت کا خزانے دار، بناؤ سنگار کا شوقین، بول چال کی نفاست کا شیدا۔ پنجابیوں کی جفاکشی کو آدمیت کے خلاف سمجھنے والا۔ قدمت کی خوبیوں کا گرویدہ۔ تقریر و تحریر میں اعجاز دکھانے والا، مگر پنجابی کی طرح تحریروں کا انبار نہیں لگا سکتا“ (وطنی خصایل: یوپی والہ کے خصایل، ص ۱۹۹)

سرکاری افسر کے خاکے کی طرز کی ایک خاصے کی چیز ماڈرن معشوق کے خصایل ہیں، ملاحظہ کیجیے خواجہ کے طرح دار قلم نے انہیں کیسے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے:

”پہلے سرو کی طرح لمبا، کھجور کی ٹہنی کی مثل دہلا، گیسو سانپ، ماتھا چاند، رخسار سبب بھڑکی کنواں، ہونٹ یا قوت اور

لعل، دانت موتی، گردن صراحی، چھتیاں سنگ خارا، کمر غائب، بھوس کمان، پلکیں بر چھیاں، آنکھیں شراب کا جام، نظریں تیر تلوار خنجر تھیں اور شاعران تشبیہات کو مختلف طریقوں سے بیان کرتے تھے، مگر آج کل کے ماڈرن معشوق کا حلیہ اور اس کی تشبیہات یہ ہیں:

قد ایسا جیسا اخبار کا کالم، بال ایسے جیسے تن خواہوں کی تحفیف، پیشانی ایسی جیسے وہاٹ پیپر، بھوس ایسی جیسے اسمبلی ہال، پلکیں لکھنے کا باریک نب، آنکھیں ایکھا نمبروں کے ننھے ننھے دو گلاس، نگاہیں کنزرویٹو گورنمنٹ کی پالیسی، رخسار باشو یک یا سرحدی سرخ پوش، تھوڑی برٹش ڈپلومیسی، ہونٹ انگریزی کھانے کی لال جیلی، دانت کانگریسی زبان کا جیل خانہ، گردن جودھ پوری برجس، چھتیاں پیئیر کی چلتیاں، کمر ہندوستان کا اتفاق، بالوں کی کتر شامیانے کی جھالر، بالوں کا تیل چھوند ر کے آنسو، چہرے کا پوڈر ملکی ہم دردی۔ ایسا نازک جیسے خطاب پرست کا دل، ایسا ضدی جیسے پولیس کا سپاہی، ایسا بے وفا جیسے دہلی لیڈر اور ایسا ہرجائی جیسے تمباکو اور ایسا منہ چڑھا جیسے چائے کی پیالی۔ چلتا ہے تو سگریٹ کے دھوئیں کی طرح بل کھاتا ہوا، دیکھتا ہے تو خورد بین بن جاتا ہے، بولتا ہے تو بیاناو معلوم ہوتا ہے۔ وہ پہلے درخت تھا جانو ر تھا اور ایک ڈراؤنا ہوا تھا۔ اب آدمی تو بن گیا ہے مگر کچھ گورا ہے، کچھ کالا ہے، کچھ کچا ہے، کچھ پکا ہے۔ پہلے فرہاد، مجنوں اور راجھا اس کے عاشق تھے اور وہ شیریں، لیلی، ہیر کے نام سے پکارا جاتا تھا اور اب سب عورت مرد معشوق بن گئے ہیں۔ کیوں کہ ہر شخص مخاطب کو چاہے عورت ہو یا مرد، ڈیر (پیارا۔ پیاری) کہتا اور لکھتا ہے۔ گویا معشوقیت میں بھی جمہوریت ہو گئی ہے۔

پہلے جوانی میں یاد آتا تھا، اب طبی کمپنی دہلی کے فاسفورس کے تیل کی طرح بچپن اور بڑھاپے میں کام آتا ہے، پہلے رقیب ہی پر مہربان تھا، شاعر کو بہت ستاتا تھا۔ اب بہت ملن سار ہو گیا ہے، اچھوت ذاتوں کے آغوش میں بھی چلا جاتا ہے، پہلے دل لیتا تھا اب روپیہ لیتا ہے۔ پہلے گلیوں میں رہتا تھا اب کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہتا ہے۔ پہلے کافر تھا اب عیسائی ہو گیا ہے۔ پہلے بت تھا بولتا نہ تھا اب باتوئی ہو گیا ہے۔

نئی روشنی کا یہ معشوق مہنگا نہیں ہے ارزاں ہے، ہر جگہ مل جاتا ہے۔“ (طبقاتی خصائل: ماڈرن معشوق کے خصائل: ص ۲۰۱، ۲۰۲)

”ڈاکٹر کے خصائل“ میں خواجہ صاحب نے ضمنی طور پر بعض ایسی باتیں کہی ہیں جن کی عام طور پر اس قسم کی انشا پر دازی میں توقع نہیں کی جاتی۔ ذرا دیکھیے کہ درآمد برآمد میں توازن اور زرمبادلہ کے ذخائر کی اہمیت سے خواجہ حسن نظامی نہ صرف واقف ہیں بلکہ موقع پا کر مطلب کی بات بھی کہہ گئے ہیں:

”ڈاکٹر پڑھتا ہے تو ایسی محنت سے کہ اس کی آنکھ اور اس کا دماغ اور اس کا دل اور اس کا معدہ بیمار ہو جاتا ہے اور پڑھ کر فارغ ہوتا ہے تو ہر مرض کی دوا بن جاتا ہے..... ڈاکٹر غریب و مفلس ہندوستان میں بہت مہنگا معالج ہے اور اس کی وجہ سے ہر سال ۹۵ کروڑ روپے کی دوائیں اور آلات غیر ملک سے آکر اس ملک میں پک جاتے ہیں اور ملک کی دولت باہر چلی جاتی ہے۔ ڈاکٹر لکیر کا فقیر نہیں ہوتا“ (پیشہ وارانہ خصائل؛ ڈاکٹر کے خصائل، ص ۲۰۲)

خواجہ صاحب کا یہ کہنا کہ ”ڈاکٹر لکیر کا فقیر نہیں ہوتا“، جارج برنارڈ شاہ کے فرمودہ سے بالکل مختلف ہے۔ شاہ نے اپنے مضمون Are Doctors Men of Science میں ڈاکٹرز کے لکیر کے فقیر ہونے کو ثابت کر کے ان کا کافی تمسخر

اڑایا ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ خواجہ مرحوم نے ڈاکٹرز کے مقابل حکیموں کی خوب درگت بنائی ہے، ذرا تصور کیجئے کہ اگر برنارڈ شاہ حکیموں پر قلم اٹھاتا تو کیا قیامت ڈھاتا:

”کونوئیں کے اندر رہتا ہے اور کہتا ہے کہ دنیا بس یہی ہے باہر کچھ بھی نہیں ہے۔ حکیم کو اس عقیدے پر اتنا اصرار ہے کہ اپنی طب کی ایک لمبی کلیئر کا فقیر بنا بیٹھا رہتا ہے..... حکیم پیشے کی رقابت میں ہر پیشہ ور سے بڑھا ہوا ہے۔ اپنے نئے نئے کو اسیر اور دوسرے کے نئے کوزہ ہر کہتا رہتا ہے اور ڈاکٹری اس کی اس خصلت سے فائدہ اٹھاتی رہتی ہے..... حکیم مفید دواؤں کو اپنی اولاد سے بھی مخفی رکھتا ہے اور کسی کو نہیں بتاتا اور قبر میں ساتھ لے جاتا ہے“ (پیشہ وارانہ خصائل: حکیم کے خصائل، ص ۲۰۳)

سرجن حضرات کیسے کیسے گل کھلاتے ہیں، خواجہ صاحب کی زبان سے ہی سنئے:

”ہندوستان میں ڈاکٹر اور ڈاکٹری کا جب سے رواج ہے، بیماریاں بڑھ گئی ہیں..... یہ بے ضرورت آپریشن یعنی جراحی کرتے ہیں..... لکھنؤ کے ایک ڈاکٹر کا حال سنا کہ اس نے ایک مریض کے آپریشن کی فیس تین سو روپے بتائی اور جب معاملہ طے ہو گیا اور مریض کو آپریشن کے کمرے میں میز پر لٹا دیا گیا تو ڈاکٹر نے مریض کے وارثوں سے کہا کہ میں نے فیس کم کہی، اب مریض کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آپریشن بہت بڑا ہے اور پانچ سو روپے سے کم اس کی فیس نہ ہوگی۔ وارثوں نے مجبوراً پانچ سو روپے منظور کر لیے اور ڈاکٹر نے مریض کو بے ہوش کر کے پیٹ میں شگاف بھی دے دیے۔ اس کے بعد ڈاکٹر کمرے کے باہر آیا اور وارثوں سے کہا کہ شگاف دینے کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ آپریشن بہت پیچیدہ ہے اور اس میں مجھے بہت زیادہ محنت کرنی پڑے گی ورنہ مریض کی جان کا خطرہ ہے۔ لہذا آپریشن کی فیس ایک ہزار روپے لوں گا۔ وارثوں نے یہ بات سنی تو اپنے بیمار کی جان بچانے کے لیے بادل نخواستہ ہزار روپے فیس منظور کر لی اور تب اس ڈاکٹر نے آپریشن کو مکمل کیا..... وکالت اور ڈاکٹر اور رنڈی کا پیشہ یہ سب ہندوستان کو مفلس بنانے والے ہیں۔“ (پیشہ وارانہ خصائل: آپریشن کے ڈاکٹر، ص ۲۰۳، ۲۰۴)

خواجہ صاحب وکیلوں کی خبر لینے سے بھی نہیں چو کے۔ شاید تحریک خلافت میں وکلانے ایسا برجوش کردار ادا نہ کیا ہو جیسا ہمارے دور میں چیف جسٹس کی بحالی میں ان کا رہا ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، وکلا حضرات اپنا خاکہ پڑھ کر بغلیں جھانکتے نظر آئیں گے:

”اکثر جرایم پیشہ لوگوں کے لیڈروں کیوں اور بیرسٹروں کے علاوہ رشوت خور پولیس والے لکھی ہوتے ہیں لیکن مجرموں کی لیڈری کا بڑا حصہ وکیلوں ہی کے حصے میں آتا ہے..... ہندوستان میں جتنے سیاسی لیڈر ہیں وہ سب یا اکثر پہلے وکالت کا پیشہ کرتے تھے، ان میں سے بعض اس پیشے کی برائیوں کو محسوس کر کے تارک ہو گئے، جیسے کہ گاندھی جی ہیں اور مالوی جی ہیں اور مسٹری آرداس تھے اور نہرو جی تھے۔ مگر بعض لیڈر ایسے ہیں جو اب تک وکالت کا پیشہ بھی کرتے ہیں اور لیڈری بھی کرتے ہیں..... ہندوستان میں آدھی تباہی رنڈیوں کے ہاتھوں سے ہو رہی ہے اور آدھی تباہی وکیلوں کے اور مقدمے بازیوں کے ذریعے ہو رہی ہے۔“ (پیشہ وارانہ خصائل: مجرموں کے لیڈروں کیوں، ص ۲۰۴، ۲۰۵)

اب نجانے کون سی بات درست ہے کہ سیاسی لیڈر، وکالت کے پیشے کی برائیوں کو محسوس کر کے تارک ہو گئے تھے اور ہو جاتے ہیں یا وکالت کی نسبت سیاست میں برائیوں کے زیادہ امکانات کی وجہ سے پورے سیاسی ہو گئے تھے اور ہو جاتے ہیں؟ ہم فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ البتہ ایک پتے کی بات گوش گزار کریں گے کہ اگر بیرسٹر اعتراض احسن کے کرداری

پنڈولم پر نظر رکھی جائے تو فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی۔

خواجہ مرحوم کی خاکہ نگاری کم نگاہی سے مملو نہیں ہے۔ انہوں نے سستی شہرت کے لیبل سے بچنے کی خاطر ایسے متنازعہ موضوعات پر قلم اٹھانے سے گریز نہیں کیا، جن کی بابت مشرقی معاشرے میں کافی حساسیت پائی جاتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی، ایک ناول نگار کے مانند زندگی کو اس کی پوری جزئیات سمیت دیکھتے اور قبول کرتے ہیں، یہ جزئیات چاہے کتنی ہی مکروہ ہوں۔ اس لیے ان کے خاکے یک رنگ رہنے ہونے کے بجائے تنوع کے حامل ہیں۔ آنکھیں بند کرنے سے حقیقت بدل نہیں جاتی، لہذا آنکھیں کھول کر زندگی کے اس روپ کو بھی دیکھیے:

”نا یکہ ظاہر میں ایک سن رسیدہ، خاموش اور دنیا سے بے زار عورت معلوم ہوتی ہے، لیکن وہ شیطان کی خالہ ہے اور گربہ مسکین ہے۔ دنیا کے تمام سیاسی مدبرین ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور دوسرے پلڑے میں ہندوستان کی کسی نا یکہ کور کھ دیا جائے تب بھی ڈپلومیسی اور فریب کاری اور غلط بیانی میں نا یکہ کا پلہ جھک جائے گا“ (کاروبارِ شیطننت: نا یکہ کے خصائل، ص ۲۰۶)

اگر قارئین تصرف کی اجازت دیں تو معروضی حالات کے پیش نظر یہاں ”ہندوستانی نا یکہ“ کے بجائے ”ہندوستان“ حقیقت کی بہتر ترجمانی کرے گا۔ خیر! یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ خواجہ صاحب نے نا یکہ کے کردار کا درست نقشہ کھینچا ہے..... لیکن اگر اسے نا یکہ ہی کا نقشہ تصور کیا جائے، کیونکہ ذرا غور کرنے سے یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ دنیا کے تمام سیاسی مدبرین، فریب کاری اور غلط بیانی میں ایسا بد طوٹی رکھتے ہیں کہ خاکہ نگار کی نظروں میں نا یکہ کی بد کرداری کے ابلاغ کے لیے اور کوئی کردار چاہی نہیں۔ یہ نکتہ پہلو دار ضرور ہے لیکن دوران کار ہرگز نہیں، کیونکہ عمومی طور پر سیاسی مدبرین کو سنجیدگی سے لیا جاتا ہے جب کہ نا یکہ کا کردار دنیا کے ہر سماج میں منفی اور قابل مذمت سمجھا جاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے کنائے میں سیاسی مدبرین کی ایک نمایاں خصوصیت کا خوب خاکہ اڑایا ہے۔ اپنے سماج کے مختلف طبقات کے طور اطوار پر خواجہ صاحب کی اتنی کڑی نظر ہے کہ بعض اوقات گمان ہوتا ہے کہ کہیں وہ خود بھی انہی کا حصہ نہ ہوں۔ دیکھیے ذرا، زبان و بیان کی لطافت کا لبادہ اوڑھا کر سماجی کشادگی کا اظہار کتنے حقیقی پیرائے میں کیا گیا ہے:

”یہاں ہر رنڈی کے گھر میں ایک مکھی مار کاغذ رہتا ہے جس پر بہت سی عیاش کھیاں آکر بیٹھتی ہیں اور چپک کر رہ جاتی ہیں اور بہت عرصے تک جان کنی میں مبتلا رہ کر مر جاتی ہیں..... یہ رنڈی ہندوستان کی آدھی تباہی کا باعث ہے۔ جتنی جائیدادیں سوڈخواروں کے پاس دولت مندوں کی رہن اور بیچ کے ذریعے جاتی ہیں، ان میں زیادہ حصہ رنڈی بازی کی وجہ سے ہوتا ہے“ (کاروبارِ شیطننت: رنڈی، ص ۲۰۷)

آج بھی غیر جانب دارانہ سروے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آئے گی کہ وطن عزیز کی تباہی کے جملہ عناصر میں رنڈی بازی بدرجہ اتم موجود ہے۔ کچھ عرصہ قبل ہی ایک اداکارہ اور ایک سرمایہ دار کی توں تکار میڈیا میں موضوع سخن بنی رہی۔ خواجہ صاحب کی خاکہ کشی سے قطع نظر، حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنے تصور خودی کے تناظر میں اداکاری کو پسندیدگی سے نہیں دیکھا تھا کہ اس سے اداکار اپنی خودی کو مسل کر شتر بے مہار بن جاتا ہے۔ اب اگر پورا سماج، شتر بے مہار کی پیروی پر آئے (خیال رہے اتباع و پیروی، مقصود بھی ہوتی ہے کہ تفریح سے ہٹ کر، ہر ڈرامے فلم وغیرہ کا مرکزی خیال عام طور پر اصلاحی

ہوتا ہے جس کے ابلاغ کے ذریعے معاشرتی سدھار کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ تماشائی، اصلاحی پیغام کے بجائے کسی فن کار کی اداؤں پر فریفتہ ہو جاتے ہیں، اس کے اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے بولنے اور لباس پہننے [معاف کیجیے گا، اتارنے تک] کی اندھا دھند تقلید کرتے جاتے ہیں، اور اصلاحی مقصد دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے، تو غور کیجیے گا کہ کتنی خودیوں کا خون ہوتا ہے اور وہ بھی کسی بڑی خودی کے بے مہابا فروغ کے باعث نہیں، بلکہ کسی فن کار کی اپنی خودی کی نفی سے۔ خواجہ حسن نظامی نے اسی قبالی فکر کو اپنے الفاظ کا جامہ اس طرح پہنایا ہے:

”وہ اور اس جیسی سب خوب صورت ایکٹریں جب ڈرامہ نویسوں کے ان الفاظ کو تماشائیوں کے سامنے بولتی ہیں جن میں بیسوا کی برائیاں ہوتی ہیں تو ان کا دل ہنسا کرتا ہے کیوں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ان الفاظ سے طوائف بازی کا ذوق کم نہیں ہوتا بلکہ جذبات میں نیکی آمیز گناہ پیدا ہو جاتے ہیں“ (فن کار: کج، ص ۲۰۸)

”نیکی آمیز گناہ“ پر غور کیجیے کہ اس ترکیب سے ایک نفسیاتی حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ انسان اپنے گناہ کے جواز کے لیے عموماً ایسا افسانہ گھڑ لیتا ہے جس سے اس کا گناہ، مزین ہو کر اس کے سامنے آتا ہے اور احساس گناہ کا تڑپا دینے والا جذبہ رخصت ہو جاتا ہے۔ ایسا نیکی آمیز گناہ، حقیقی گناہ سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ اس میں ندامت دلانے والی بے کیف رکھنے والی ضمیری رگ کو تھپک تھپک کر سلا دیا جاتا ہے، جبکہ حقیقی گناہ میں ضمیر کی خلش انسان کو سکون و چین کی نیند نہیں سونے دیتی اور انسان کروٹیں بدل بدل کر بے حال ہو جاتا ہے۔

”فن“ کے نام پر ”فن کار“ کیا کیا گل کھلاتے ہیں، جھوٹ و غلط بیانی کے کتنے ق و دق صحرا ہر روز عبور کرتے ہیں اور اپنے چاہنے والوں کو سراب میں مبتلا کر کے ان کی جمع پونجی اینٹھ کر نو دولتوں کا ایک جاہل مگر با اثر طبقہ کیسے کھڑا کرتے ہیں، خواجہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

”عمر تم پوچھو تو سولہ، وہ پوچھیں تو کبھی سولہ سے کم، کبھی سولہ سے بہت زیادہ، اور کبھی ان جان ہو کر کہے اماں کو معلوم ہے کہ میں کتنے برس کی ہوں..... اس کا اثر فلم دیکھنے والے ہندوستان کے لیے طاعون اور ہیضے اور ملیبیا کے جراثیم سے زیادہ متعدی ہے۔ وہ سٹیج کی حکم ران ہے جو توپوں، ہوائی جہازوں اور تباہ کن کشتیوں کے بغیر سینما دیکھنے والوں پر حکومت کرتی ہے۔ اس کے دیکھنے میں، اس کے بولنے میں اور اس کے متحرک ہونے میں ایک جادو چھپا رہتا ہے..... وہ بولتی ہوئی جھاڑو ہے جو غریب ہندوستانیوں کی جیب صاف کر کے دولت کا سارا کوڑا فلم کمپنیوں کی جیب میں پھینکتی رہتی ہے“ (فن کار: سلو چنا، ص ۲۰۹)

اس تالیف کو پورب اکادمی اسلام آباد نے نہایت خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ ۲۳۲ صفحات کی اوسط درجے کے کاغذ پر طبع کتاب کی قیمت ۲۲۵ روپے بہت زیادہ نہیں ہے۔ آج کل ان بیچ کمپوز ڈکٹ، پروف ریڈنگ کے اعتبار سے قاری کو مطمئن نہیں کر پارہی ہیں لیکن اس کتاب میں پروف ریڈنگ کا معیار نہایت اعلیٰ ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ پورب اکادمی کے ذمہ داران ادبی ذوق رکھنے کے علاوہ جدید تکنیکی تقاضوں سے بھی کافی آگاہ ہیں، اس لیے پوری کتاب میں ہمزہ کے ترک کے ساتھ ساتھ لفظوں کو ممکن حد تک توڑ کر املا کیا گیا ہے جس پر پورب اکادمی کے ذمہ داران مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ویب سائٹ www.poorab.com.pk، ای میل: info@poorab.com.pk